Volume 03, Issue 02,
April-June 2025
PP: 153-165
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X

وجودیت: انسانی وجود کا ادراک

Existentialism: The Perception of Human Existence

Dr. Hina Asghar [1]*, ***Dr. Muhammad Kamran Shahzad*** [2]

Article History

Received
26-05-2025

Accepted
27-06-2025

Published
30-06-2025

Indexing

ICI World of Journals, Asian Research Index, Signatory of DORA, اردو جرائد اشاریہ, ACADEMIA, Google Scholar, EuroPub

Abstract

The human being is the central axis of the universe, carrying within himself the purpose, responsibility, and relationships that give meaning to worldly existence. Man not only strives for his survival but also embodies moral, social, and spiritual duties that shape his life. Created by Allah as the most honored of all beings, human existence is elevated in status, and it is through self-realization that one may truly come to know the Creator. The question of existence, therefore, holds a significant place in both philosophical and theological discourse. From ancient philosophers to modern thinkers, the concept of existence has remained a critical topic, ultimately giving rise to the philosophical movement known as Existentialism. The 20th century, marked by scientific advancements, world wars, and rapid societal transformation, saw a heightened interest in this school of thought. As rationalism dominated the intellectual landscape, existentialism emerged both in response to and in resistance against it focusing instead on individual freedom, choice, alienation, and the search for meaning. This paper explores the core concepts of existentialism, its historical development, and its philosophical foundations. Furthermore, it highlights how existentialist ideas permeated literature, influencing themes, characters, and narrative structures. The study underscores the relevance of existentialism in understanding the human condition and its deep resonance in both modern and postmodern literary works. By linking the existential quest with spiritual and philosophical inquiry, the paper offers insights into how human beings grapple with meaning in a complex, often contradictory world.

Keywords:
Human Existence, Existentialism, Self-Realization, Philosophy of Existence, Modern Literature, Individual Freedom, Alienation, Meaning of Life, Rationalism, 20th Century Thought, Spiritual Identity, Islamic Perspective on Man.

[1]*Assistant Professor (Visiting), Department of Urdu, University of Education, Lower Mall Campus, Lahore.* hinaasghar32@gmail.com. ****Corresponding Author***
[2]*Lecturer, Department of Urdu, University of Sargodha.*

All Rights Reserved © 2025 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

HIRA INSTITUTE of Social Sciences Research & Development

ROAD Directory of Open Access Scholarly Resources — OPEN ACCESS

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اس کے وجود کو تمام مخلوقات پر فوقیت دی ہے۔ اگرچہ یہ وجود خاک سے بنا ہے مگر اس کی عقل نے اس کائنات کو تسخیر کیا ہے۔ اس نے کارزارِ جہاں کو اپنی عقل سے گل وگلزار بنادیا اور ایسے کارہائے نمایاں سر انجام دیئے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہی وجودِ خاکی اپنی اہمیت کی بنا پر دنیا کا مرکز و محور بنا۔ اسی کے وجود پر کائنات کا وجود موقوف ہے۔ انسان اس کائنات میں اپنے وجود کی جنگ لڑتا ہے، انسان بہت سے رشتوں سے وابستہ ہے، اس پر بہت سی ذمہ داریاں و فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ان تمام کو انسان اپنے وجود ہی سے پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ انسان خدا کو بھی تب ہی پہچان سکے گا جب وہ اپنی ذات کا ادراک کرے گا۔ اسی وجہ سے دنیا میں وجود کا مسئلہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ دور قدیم کے فلسفیوں سے لے کر عہدِ حاضر کے فلسفیوں کا موضوع بحث رہا ہے۔ وجود کے مسئلے ہی نے وجودیت کے فلسفے کو جنم دیا۔

وجودیت کا لفظ وجود سے نکلا ہے جو کہ اسم مذکر ہے۔ اس کے لغوی معنی ہستی، بدن، جسم، زندگی، موجودگی اور پیدائش حیات ہے۔ انگریزی میں اس کے لئے Exist (ہونا، رہنا، زندہ رہنا) یاExistence(وجود، زندگی، قیام، ہستی) جیسے لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ڈاکٹر سعادت سعید لفظ وجود کی اہمیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> وجود کا لفظ اس موجودگی کا مظہر ہے جس میں شخصیت اور ذات کا مکمل اثبات ہو۔[1]

بیسویں صدی انقلاب زمانہ کی صدی ہے اس صدی میں سائنسی ترقی اور جنگوں نے دوسرے شعبوں کی طرح ادب پر بھی اثرات مرتب کیے ہیں۔ انہی اثرات کے زیر عقلیت پسندی پر زور دیا گیا اور اس سے گریز نے وجودیت(Existentialism) جیسے اہم فلسفہ حیات کی بنیاد رکھی۔ عہد حاضر کا انسان معاشرتی انحطاط، معاشرتی و معاشی مجبوریوں کی وجہ سے ایک کرب میں مبتلا ہے اور اسی کرب نے اسے سماجی و معاشی سرگرمیوں میں اس قدر مصروف کر دیا ہے کہ وہ ناصرف فطرت بلکہ اپنی ذات سے بھی بے گانہ ہو کر رہ گیا ہے۔بقول شاعر خالد مبشر:

مجھے شک ہے ہونے نہ ہونے پہ خالدؔ
اگر ہوں تو اپنا پتا چاہتا ہوں

بیسوی صدی میں رونما ہونے والی جنگوں نے معاشرہ کو شکست وریخت سے دوچار کیا۔ معاشرہ میں انسان کو کل اور مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ جب اس نے ترقی کے لیے اپنے گاؤں، قصبوں اور قبائل کو چھوڑ کر شہر کا رخ کیا تو شہری نظام میں اسے احساس تنہائی شدت سے محسوس ہوا اور اسی تنہائی، کرب اور جدائی کے احساس کی بدولت اس کی توجہ اس کے وجود کی اہمیت کی طرف ہوئی اور اس نے اپنی ذات کو مرکز مان لیا، اس طرح وجودی فلسفے نے جنم لیا۔ انسانی ذہن کی بیداری اور اپنی ذات کی پہچان کا ادراک وجودیت کی بنیاد بنا۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان اپنی کتاب "منتخب ادبی اصطلاحات" میں اس فلسفے پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> وجودیت کا مرکزی تصور یہ ہے کہ آدمی وہی کچھ بنتا ہے جو وہ بننا چاہے۔ خدا یا معاشرے کی طرف سے بطور جبر اس پر کوئی تقدیر مسلط نہیں کی گئی۔ آدمی کے پاس اختیار ہے اور ساتھ ہی ذمہ داری کا وہ احساس جو اختیار کا عطاء کردہ ہے۔ اگر وہ اپنے لئے کوئی راہِ عمل نہیں چنتا یا باہر کی طاقتوں کے سامنے سر جھکا کر مجہول انداز میں جیے جانے پر راضی ہے تو قابل حقارت ہے۔[2]

جہاں تک وجودیت کی تحریک کا تعلق ہے یہ تحریک بیسویں صدی میں رونما ہونے والی اہم فکری و فلسفیانہ تحریک ثابت ہوئی۔ دورِ جدید کا انسان اپنے آپ کو ترقی پسند، ماضی پسند اور حقیقت پسند جیسے رجحانات میں دیکھنے کا قائل نہیں۔ انسان کی ذہنی بیداری نے فلسفہ وجودیت کی

بنیاد رکھی۔ آج کا انسان اپنے وجود کی جدوجہد میں مشغول ہو گیا۔ وہ اپنی سابقہ محرومیوں کو مٹانا چاہتا تھا۔ وجودی فلسفے نے انسان کی امتیازی شناخت کے ادراک پر زور دیا۔ اس فلسفہ سے اس نکتہ کو دورِ جدید کے انسانوں نے جانا کہ اس کی ذات و وجود اس کائنات میں کیا معنی رکھتے ہیں۔ وجودیت کا فلسفہ اتنا اہمیت کا حامل ہوا کہ وجودیت جیسے عظیم فکری زاویے کو کئی فلسفیوں نے مشعل راہ بنایا اور اپنی تحاریر میں وجودی فلسفے کا پرچار کیا۔ اس فلسفے کی کوئی حتمی تعریف کرنا قدرے مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ لیکن چند تعریفوں سے وجودی نظام کی تفہیم میں مدد لی جاسکتی ہے۔ بقول سی اے قادر:

وجودیت کا فلسفہ تنہائی اور بیگانگی یا غیریت کا فلسفہ ہے۔ یہ اس دور کی پیداوار ہے جب انسان اپنی تمام اقدار کھو بیٹھتا ہے۔ مذہب سے مایوس ہو چکا ہوتا ہے اور اسے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔ یہ دور یورپ میں عالمی جنگوں سے پیدا ہوا انسان درندوں اور وحشیوں کی طرح لڑا۔ ہر قدر کو ٹھکرایا گیا نہ اخلاق کا پاس رہا نہ مذہب کا۔ جنگوں نے مذاہب اور اخلاق دونوں کو تباہ کر دیا۔ نوجوانوں کو احساس ہوا کہ ماضی کا اخلاق ان مسائل کو حل نہیں کر سکتا ہے۔ پرانی اقدار ختم ہو چکی ہیں۔ مذہب ناکارہ ہو چکا ہے اور فلسفہ بھی دور از قیاس باتوں کا مجموعہ بن گیا ہے تو انسانی درد کا مداوہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب وجودیت نے پیش کیا۔ [3]

وجودی فلسفے نے انسان میں اس کے انفرادی جوہر کو بیدار کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ انسان زندگی کے ہر فیصلے میں اپنی قوتِ فیصلہ کو بروئے کار لا کر زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر وجودیت کے فلسفے کی تشریح کچھ یوں کرتے ہیں:

میں نے وجودی مصنفین کو تواتر سے پڑھا ہے اور میں ان سے متاثر ہوں۔ وجودیت جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں تو بنیادی طور پر فرد فرد (Individual) کا فیصلہ ہے اور ہر وہ شخص، ادیب، دانشور جو اپنی زندگی میں بے معنویت، یاسیت عدم تحفظ کا شکار ہو اس کے لئے اس تصور میں خاصی کشش ہے۔ [4]

عصرِ حاضر کا انسان محرومی، کرب، ذہنی انتشار اور تنہائی کا شکار ہوا۔ لاکھوں کروڑوں مرتے ہوئے انسانوں کو دیکھ کر اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان مرتے ہوئے لوگوں کی کوئی شناخت، مذہب یا حوالہ نہیں ہے تو ہماری زندگی کا کیا حوالہ ہو سکتا ہے۔ اسی سوچ و فکر نے انسان کے ذہن میں تغیر پیدا کیا اور اس کو شدت سے محرومی، جدائی، کرب اور اپنے کھو جانے کا احساس ہوا۔ انسان کو اپنے ہونے کا احساس ہوا ۔ وجودیت کے فلسفے کی بنیاد اس نظریے پر رکھی گئی کہ جو موقع پر موجود ہے وہی انسان لمحہ موجود میں ہیں۔ عالمی جنگوں کے اس عہد میں مختلف تخلیقات میں بھی انسانی معاشرہ و ذات کی شکست وریخت نمایاں ہے۔ وجودیت کے فلسفے نے انسان کو ذہنی انتشار سے نکال کر اپنی ذات پر اعتبار و اعتماد کرنا سکھایا اور انسانی زندگی کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

اس فلسفہ (وجودیت) نے بیسویں صدی کے ذہنِ انسانی کو ناامیدی، بے یقینی، عدم اعتماد اور بحران سے نجات دلا کر اپنی ذات پر اعتماد کرنا سکھایا۔ اس نے خیر و شر کی ساری ذمہ داری فرد کے کندھوں پر ڈال دی اور بتایا کہ آدمی اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ خود کو بناتا ہے، ذات کے عرفان کا مسئلہ ہم مشرقیوں کے لیے کوئی ایسی نئی چیز نہیں ہے ۔۔۔۔۔ عرفان ذات کے اس فلسفے نے بحران زدہ انسان میں زندگی کی روح پھونک دی۔ [5]

وجودیت کا فلسفہ روزمرہ زندگی کا احاطہ کرتا ہے یہ گوشت پوست کے حقیقی انسان کا متلاشی ہے۔ یہ انسان کی داخلی کیفیات و جذبات کا عکاس ہے۔ وجودی مفکر و فلاسفہ مصروفیات کی بجائے حقیقی تجربے سے مستفید ہونے کے خواہاں ہیں۔ وجودی فلسفے نے انسان میں وہ جرات و انفرادی جوہر کو پیدا کیا جس سے انسان کی قوت فیصلہ بڑھی اور اسی قوت فیصلہ کو بروئے کار لا کر وہ اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔

وجودیت کی دو اقسام ہیں: ایک دینی وجودیت دوسری لادینی وجودیت۔ ان دونوں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ ان میں سے دینی وجودیت کے قائل فلسفی خدا کے وجود کو مانتے ہیں جبکہ لادینی گروہ خدا کے وجود کا منکر ہے۔ پہلے گروہ کا نمائندہ سرن کیکارڈ تھا اور باقی اس کی تقلید کرنے والوں میں جبریل مارس، رچرڈ کرونز وغیرہ اور لادینی وجودیت کا علمبردار سارتر اور مارٹن ہیڈیگر ہے۔ ان دونوں گروہوں کے فلسفی اس بات پر متفق ہیں کہ وجودیت ماہیت مقدم ہے یعنی Existence Precedes Essence وجود سے مراد فرد کا وجود ہے۔ انسانی وجود کی اہمیت کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا۔ اس نظریے کے مطابق ہر فرد ایک دوسرے سے مختلف ہے وہ اپنے ہر عمل میں آزاد و بااختیار ہے اور اپنے عمل کا خود ہی ذمے دار ہے۔ "وجودی اعلان کرتا ہے کہ وہ معروضی دنیا کی بجائے صرف اپنے تجربے کو حقیقی جانتا ہے۔ اس کے نزدیک ذاتی ہی حقیقی ہے۔ وہ اپنی بے مثال انفرادیت پر اصرار کرتے ہوئے فطرت اور طبعی دنیا کی عمومی خصوصیات کے مقابلے میں اپنے وجود کو اساسی حیثیت دیتا ہے۔[6]

وجود کی تعریف کرنا آسان نہیں لیکن کچھ نکات ایسے ہیں جن پر تمام وجودی کے حامل مصنفین متفق ہیں:

- وجودی اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ سائنس ہمارے حیاتی و قدرتی مسائل حل کرنے کی اہل ہے۔ ان کے نزدیک سائنس کی اہمیت اس کی افادیت میں مضمر ہے۔ وہ صداقت کی یافت کے ذریعے کے طور پر اہم نہیں۔
- عقل کی مدد سے حقیقت تک رسائی ناممکن ہے منطقی تراکیب بھی اس سلسلے میں معاونت نہیں کر سکتیں۔
- وجودی دانشور ان تمام سماجی نظریات کی تکذیب کرتے ہیں جن میں فرد کو گروہ کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے اس لحاظ سے وہ قوم پرستی ،اشتراکیت، اشتمالیت و فسطائیت کی تمام صورتوں کے شدید دشمن ہیں۔
- تمام وجودی انسانی وجود کو شعور کے مترادف قرار دیتے ہیں اور اس کی وضاحت کو وجود کی داخلی ترکیب کی وضاحت سمجھتے ہیں۔
- وجودیت کے حامی سب انسانی وجود کی بے مثل انفرادیت اور داخلیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ وجود ان کے نزدیک تصور نہیں۔ عمل کا منفرد جذبہ ہے سچائی اور نیکی کے نزدیک معروضی حقائق نہیں بلکہ داخلی تصرفات ہیں۔
- تمام مفکرین تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ انسان کی اٹل آزادی کے علمبردار ہیں اس لیے ان کے نزدیک انسان کا وجود اس کے جوہر پر مقدم ہے۔
- وہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ انسان اپنے معدوم جوہر کی تخلیق کا نام ہے۔ وہ عدم میں ہستی کا ظہور ہے۔
- وہ سب جینے کے لیے مرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ موت کا تصور ان کے ہاں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔[7]

اس فلسفے پر بہت سے اعتراضات بھی کیے گئے جو کچھ یوں ہیں:

1. وجودیت انسان کو بیچارگی، مایوسی، خودغرضی اور بے حسی سکھاتی ہے۔
2. وجودیت زندگی کے تاریک پہلو پر زور دیتی ہے اور فرد میں تنہائی کا احساس پیدا کر کے اس کو مایوس اور مجبوری کا عادی بنا دیتی ہے۔
3. وجودیت کے مطابق انسان ہر ذلیل کام کر سکتا ہے گناہ جرم کی نوعیت کی کوئی شے باقی نہیں رہتی۔
4. وجودیت انسان کو ترقی سے روکتی ہے۔[8]

سارتر نے ان اعتراضات کا مکمل اور مدلل جواب دیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ تنہائی کا احساس انسان کے لئے بے حد ضروری ہے کہ بے بسی اور مایوسی اسے عمل کی طرف راغب کرتی ہے۔ یہ تنہائی انسان کو اس کے انفرادی وجود کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے اور اسے مطمئن کرتی ہے۔ وجودیت انسان کی مجبوریت کو ختم کرتی ہے۔ انسان اپنے لئے یقیناً نیکی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اسے مکمل آزادی ہے وہ اپنے اعمال کا خود ذمہ دار

ہے۔وہ کیوں جرم کا مرتکب ہو گا بلکہ وہ اپنے لیے ایک سیدھا راستہ چنے گا۔اس کے علاوہ سارتر کہتا ہے کہ وجود کے لیے کسی قسم کی ترقی یا تنزل کا سوال پیدا نہیں ہوتا،وجود ہر لحہ مکمل بھی ہے اور تکمیل پذیر بھی صرف حالات میں تبدیلی آتی ہے،وجود میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ بقول ڈاکٹر شاہین مفتی:

> وجودیت دوسرے نظریہ ہائے فکر کی طرح اپنا ایک سائنسی نظام رکھتا ہے۔جس کا کام ہے تہذیبی رویوں کو ان کی مخصوص حالتوں میں ایک مخصوص شکل دینا اور پھر اسی مخصوص شکل کے طفیل اپنا مدعا بیان کرنا،بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ وجودیت ہر قسم کے تجریدی، منطقی اور سائنسی فلسفے کی نفی ہے وہ عقل کی مطلقیت سے انکاری ہے، تاہم اس کا تقاضا ہے کہ فلسفے کو فرد کی زندگی، تجربے اور اس تاریخی صورتحال سے مربوط ہونا چاہیے جس میں فرد خود کو پاتا ہے کیونکہ فلسفہ وطن و تخمین کا کھیل نہیں بلکہ ایک طرز حیات ہے یہ سب کچھ لفظ وجود میں مضمر ہے۔[9]

وجودیت ایک فلسفیانہ فکری تحریک ہے جسے مغرب میں اس کے علمبرداروں نے بناتے ہوئے واضح کیا اور انسانی وجود کی اہمیت کو اجاگر کیا۔انہوں نے اپنی ادبی نگارشات میں وجود کے فلسفے کی وضاحت کرتے ہوئے اس تحریک میں اہم مقام پیدا کیا۔وجودیت کی ابتداء کرنے والوں میں سورین کرکیگور کا نام اہم ہے جس نے وجود کو جوہر پر فوقیت دی۔اس کے نظریات میں یونانی حکماء کی بازگشت "میں ہوں" سنائی دیتی ہے۔

وجودیت کے علمبرداروں میں ڈیکارٹ رینےRene, Descartes (1596-1650)فرانس سے تعلق رکھتا تھا۔اس نے یونانی زبان وادب کی تعلیم حاصل کی،اس کے علاوہ قانون کی تعلیم بھی حاصل کرنے کے بعد رینے نے سائنس فلسفہ اور حساب میں بھی مہارت حاصل کی،فلسفے کے حوالے سے اس کا بنیادی کامrules for the direction of mind ہے۔وہ فلسفے کے مدارج طے کرتے ہوئے اس انکشاف تک پہنچا" میں سوچتا ہوں،اس لیے ہوںI think therefore I amاس کا کہنا تھا کہ انسانوں کو اپنے بارے میں سوچنا اور جاننا چاہیے۔(Men must think and know for themselves.)

پاسکلPascal (1623-1662)نے باقاعدہ کہیں سے تعلیم حاصل نہیں کی۔یہ فزکس اور ریاضی میں غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا،اس کو خصوصیات کے باعث وجودیت کا پیشرو سمجھا جاتا ہے۔اس نے کہا: میں ہوں اس لیے میں سوچتا ہوں۔پاسکل کو وجودیت کا پیشرو سمجھا جاتا ہے۔

ہیگلHegel(1773-1831)کا نام بھی وجودیت کے حوالے سے اہم ہے۔یہ جرمن فلسفی تھا،اس کے فلسفہ جدلیت نے بہت مقبولیت حاصل کی،اس کے فلسفہ مظہریت سے جدید وجودیوں نے اکتساب کیا۔اس کی درج ذیل کتب نے شہرت حاصل کی۔

Science of logic 1812 -1816
Encyclopedia of philosophic science 1817
Philosophy of right 1818

کیرکیگارڈ سورین ایبےAabye soren, Kierkegaard(1813-1855)ڈینش فلاسفر تھا۔کوپن ہیگن میں پیدا ہوا۔اسا تے وجودیت کا بانی قرار دیا گیا۔اس نے ہیگل کے نظریات رد کیے۔اس نے اپنی آخری کتاب میں انسانی موجودگی کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔اس نے وجودیت کے تصور کو باقاعدہ طور پر استعمال کیا۔اس نے لفظ وجود کو نئے معنی عطاء کیے۔اس کا کہنا ہے: کوئی ذات مطلق اس کے لیے کسی کا فیصلہ نہیں کر سکتی وہ خود اپنی مرضی اور اپنے اختیار کا مالک ہے۔کرکیگارڈ کی فلسفانہ وجودیت فرد سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ترک کرے تا کہ بطور شخص اس کا وجود برقرار رہے۔اس کی درج ذیل کتب اہم ہیں:

Either or 1843

Fear and trembling 1843

The concept of dread 1844

Concluding UN scientific post script 1846

نطشے، فریڈرکNeitzshe,Friedrich(1844-1900)یہ ایک جرمن فلاسفر تھا جس نے باسل میں تعلیم حاصل کی اور پروفیسر رہا۔ نطشے کے فلسفے کے مطابق وجودی عناصر اس کی اولین تسلیم "المیہ کا جنم" The birth of tragedy 1872 میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کا رویہ ایک عظیم انسان کا ہے جو زندگی کو بیک وقت المیہ اور طربیے کے طور پر قبول کرتا ہے۔ وہ خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے اور اس کی تصوراتی موت کرواتا ہے۔ نطشے کے فلسفہ عدمیتNihilismاور اخلاقیات نے جدید وجودیوں کو متاثر کیا۔

جیسپرز، کارلJasphers,Karl(1883-1963)ایک جرمن فلاسفر تھا۔ فلسفی بننے سے پہلے ایک ماہر نفسیات تھا۔ کارل نے فلسفے میں کتب تحریر کیں۔ اس کا کہنا ہے کہ فلسفہ ایک سائنس ہے جس کا مقصد انسان اور کائنات کو سمجھنا ہے۔ کارل وجودی خیالات کا حامل تھا اور ہر سطح پر فردی آزادی کا خواہاں تھا۔ وہ افراد کو ابلاغی سطح پر آزاد، خود مختار اور با اعتماد دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ آزادی کے ابلاغ کے لیے ہر لمحے فرد کو مستعد اور متحرک دیکھنا چاہتا تھا۔

مارسل، جبرئیلGabriel, Marcel (1889-1973)ایک جرمن فلاسفر تھا وہ ہیگل سے متاثر تھا۔ مارسل فرد کے تصور کو اہمیت دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کائنات میں فرد واحد کی شمولیت اس کے جسم کی حیثیت ہے۔ اس طرح جسم اور فرد ایک ہی اکائی ہے۔

ہائیڈگر، مارٹنHeidegger,Marten (1889-1976)ایک جرمن فلاسفر تھا جس نے ایک کیتھولک گھرانے میں جنم لیا۔ ہائیڈگر کا مرکزی کام "وجود اور وقت" کے گرد گھومتا ہے۔ اس نے یہ سوال کیا: ہستی کیا ہے؟ اور یہ کیا، کیا ہے؟(what is being what is what is)وہ خود اس سوال کا آسان سا جواب دیتا ہے کہ جب تک ذاتی سطح پر ہمیں ہماری موجودگی کا ادراک نہیں ہوتا ہمیں باطنی سطح پر موجودگیوں کے بارے میں سوچتے رہنا چاہیے تاکہ ہم وجود کے واسطے سے وجود کی اتھاہ تک پہنچ جائیں۔ ہائیڈگر نے موت کو انسانی زندگی کا وجود لامتناہی بنا کر پیش کیا۔ یہ مخصوص وجود کا مخصوص انجام ہے۔

سارتر، ژاں پال(Sartre,Jean,Paul)(1905-1980)سارتر فرانسیسی وجودیت کا علمبردار ہے۔ 1938 میں اس کا ناول ناسیاLa Nauseeشائع ہوا۔ 1943 میں ان کی فلسفیانہ کتاب(وجود اور لاشیئت)Being And Nothingnessشائع ہوئی اور اسے وجودی فلسفے کا منشور قرار دیا گیا۔ سارتر کہتا ہے:

> آدمی اس کے علاوہ کچھ نہیں جو کچھ اپنے آپ کو بناتا ہے۔ یہ وجودیت کا بنیادی اصول ہے۔[10]

خدا اور اس کے وجود سے بحث کرتے ہوئے سارتر کہتا ہے:

> دوہری وجودیت جس کا میں نمائندہ ہوں اس امر کا سختی سے اعلان کرتی ہے کہ اگر خدا موجود نہیں تو بھی کم از کم ایسی ہستی ضرور موجود ہے جس کا وجود اس کے جوہر پر مقدم ہے۔ وجود جوہر پر مقدم ہے سے مراد یہ ہے کہ انسان پہلے وجود میں آتا ہے اور اپنی ذات کا سامنا کرتا ہے۔ کائنات میں ابھرتا ہے اور پھر کہیں اپنے تصور کی تشکیل کرتا ہے۔ انسان ابتداء میں کچھ نہیں ہوتا۔ وہ وہی کچھ ہے جو کچھ کہ اپنے آپ کو بناتا ہے۔[11]

سارتر کے نزدیک انسانی وجود کی کلید اس کا آزادانہ انتخاب ہے۔ سارتر لاشعور کو رد کرتا ہے کیونکہ اس سے جبریت کا احساس ہوتا ہے۔ خدا کے وجود سے انکار کے بعد سارتر نے لادینیت سے ایسے نظریات پیش کیے ہیں جو اس کی وجودی فکر میں سنگِ میل کی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کے نزدیک:

در حقیقت وجود ایک لادینی صورتحال سے مکمل نتائج اخذ کرنے کی محض ایک بسیط کوشش ہے۔[12]

سارتر کے فلسفیانہ نظریات نے بیسویں صدی کے ادیبوں اور شاعروں کو متاثر کیا۔ اس کا کہنا کہ زندگی بے معنی ہے، کائنات لایعنی ہے۔ صرف انسان مختار مطلق ہے۔ دنیا غلاظت کا ڈھیر ہے۔ عشق محض واہمہ ہے۔ اس کے باوجود انسان کو چاہیے وہ آزادی اور سکون سے زندگی بسر کرے۔ انگریزی شاعروں میں ٹی ایس ایلیٹ کو سارتر کی وجودیت کا علمبردار سمجھا جاتا ہے۔ اس کی نظم ویسٹ لینڈ(Waste Land) انسانی زندگی کی بے معنویت کی مثال ہے۔

سیمون ڈی بوار(Simone de Beaurior)(1908-1986) سیمون ڈی بوار فرانسیسی دانشور ادیبہ ہے۔ سیمون کا خیال ہے کہ ایک فرد کی آزادی کا خیال دوسرے لوگوں کی موجودگی سے بندھا ہے۔ اگر کوئی فرد واحد اخلاقی معیار پر ہے تو اس سے دوسروں کو کیا فرق پڑتا ہے۔

کامیو۔ البرٹ(Camus ,Albert)(1913-1960) کامیو فرانسیسی دانشور، ناول نگار اور مضمون نگار تھا۔ اس نے وجودی ہونے سے انکار کیا لیکن فکری مضمونوں، تمثیلوں اور ناولوں میں جو مسائل پیش کیے گئے وہ وجودی روح سے مشابہ ہیں۔ اس نے سارتر کے فلسفہ لغویت کو تقویت دینے کی کوشش کی۔ اس کا خیال ہے کہ انسان دائمی طور پر معنویت کی صورتحال سے نبرد آزما ہے مگر صورتحال پر غالب آنے والی سرگرمیاں لاحاصل ہیں۔ اس کے مطابق انسان کو Sisyphus کی مانند بے مقصد، مشقت سے بھرپور تگ و دو کا المیہ قبول کر لینا چاہیے۔

وجودیت کی مقبولیت کا سب سے اہم سبب یہ بنا کہ کامیو کو اس کے انتخاب و عمل کا حق دلایا یہ تصور انسان کو اعتماد بخشتا ہے۔ اختیار کی آزادی حاصل ہوتی ہے، داخلی کیفیات کو اہمیت دی جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وجود کو بطور وجود اہمیت حاصل ہے۔

کولن ولسن(Colin Wilson)(1931-2013) انگلستان کے مزدور گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے فلسفے کو نئی وجودیت کا نام دیا ہے۔ اس کی توجہ انسانی کمزوریاں ہیں۔ وہ کئی مقامات میں انسانوں کے تخلیقی امکانات سے صرف نظر برتتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ وجودیت کے فلسفے کا بنیاد یہ ہے کہ وہ انسانی ارادے کی افضلیت اور فرد کی اہمیت پر زور دے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر نئی وجودیت نے آگے بڑھنا ہے تو اسے مظہریت، ہم عصر فلسفہ کی تحلیل روایت اور جدید رجحانات سے رشتہ استوار کرنا پڑے گا۔

متذکرہ فلسفیوں کے علاوہ وجودیت کے علمبرداروں میں ابا گینو، روڈ لف بٹ مین، کارل بارتھ اور ماریو یونٹی کے نام بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ عدمیت اور بے حیثیتی کے تجربات دوستوفسکی، کارل گیبریل اور کافکا کی تحریروں میں بھی نظر آتے ہیں۔

وجودیت کی تحریک کی مقبولت کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ اس سے انسانی زندگی کو مجبوری و مقہوری، انسان کی بے معنی زندگی میں ذاتی اعتماد اور ذاتی امن کا وہ دیا روشن کیا گیا جو کائناتی ظلمت میں معمولی تبدیلی کا باعث ہے لیکن اس نے روشنی کا استعارہ بن کر اپنا اثبات چاہا۔

اردو ادب کی تاریخ وارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اردو ادب کا بنیادی ڈھانچہ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی نظریات و تصورات کے امتزاج سے بنا ہے۔ فرانس اور انگلینڈ کی تحریکوں اور نظریات و اصناف نے اردو کو متاثر کیا۔ اردو ادب میں شاعری، افسانہ اور ناول کی اصناف پروان چڑھیں۔ رومانویت، ترقی پسندی، جدیدیت و مابعد جدیدیت اور وجودیت جیسے نظریات و افکار نے فروغ حاصل

کیا۔ وجودیت کا فلسفہ بنیادی طور پر فرانس اور جرمنی کا فلسفہ ہے۔ جو پہلی جنگ عظیم کی غارت گری اور قتلِ انسانی کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آیا۔ اس میں انسانی وجود کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا اور موت کو وجود کا لازمی جزو قرار دیا گیا۔

اردو ادب میں وجودیت کے حوالے سے مطالعہ خصوصاً آزادی کے بعد شروع ہوا۔ لیکن وجودیت کی خصوصیات ہر دور کے ادب میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ اردو ادب میں وجودیت کا تعلق تصوف سے جوڑنے کی کوشش کی گئی لہٰذا اسار تر کے خدائی افکار اور لادینی وجودیت کو اردو ادب میں تسلیم نہیں کیا گیا۔ لیکن اردو ادب کے بہت سے ادیبوں نے اس میں دلچسپی لی اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔ بقول پروفیسر بختیار حسین:

> وجودیت وہ طرز فکر ہے جو انسانی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس کی ترکیب کے ذہنی اور عقلی پہلو کی بجائے جذبی پہلو پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ عقل تجربہ اور کلیت کے چکر میں پھنس کر دور ہی سے حقیقت کو ہاتھ لگا کر نکل جاتی ہے لیکن جذبہ وجود کے اندر گھس کر ہمیں دل کی گہرائیوں کا پتہ دیتا ہے۔ [13]

ریاض احمد نے بھی وجودیت کا نقطہ خاص اس کی داخلیت کو قرار دیا ہے۔

جہاں کچھ ادیبوں نے وجودی نظریے کے مثبت پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے۔ کچھ ادیبوں نے منفی اثرات کو بھی گرفت میں لیا ہے۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا کہنا ہے: وجودیت کوئی فلسفہ نہیں یہ مایوسی کا رویہ ہے۔ [14]

اردو ادب میں مختلف شاعروں اور ادیبوں کے ہاں وجودیت کی مثالیں موجود ہیں۔ اردو ادب میں کوئی بھی اس تحریک سے براہ راست معاونت کرتا دکھائی نہیں دیتا لیکن اردو کے بعض شعراء اور ادباء کی تحریروں میں وجودی عناصر شعوری اور غیر شعوری طور پر ضرور ملتے ہیں۔

اقبال کی شاعری وجودی نقطوں کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان آزاد شخصیت کا مالک ہے۔ اقبال آزاد شخص کو شاہین، مردِ مؤمن، مرد خود آگاہ، قلندر، خودی کا ترجمان، خودی کا رازداں، صاحب لولاک، سوارِ اشہبِ دوراں وغیرہ کہتے ہیں۔ یہ آزاد شخص قبیلے کی آنکھ کا تارا ہے جس نے ہر معاملے میں خود فیصلہ کرنا ہے اور خطرے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھنا ہے۔ اقبال اپنی ایک نظم "شعاع آفتاب" میں انسانی وجود کی بے قراری کو یوں بیان کرتے ہیں:

صبح جب میری نگہ سودائی نظارہ تھی
آسماں پر اک شعاع آفتاب آوارہ تھی
میں نے پوچھا اس کرن سے "اے سراپا اضطراب!
تیری جان ناشکیبا میں ہے کیسا اضطراب
تو کوئی چھوٹی سی بجلی ہے کہ جس کو آسماں
کر رہا ہے خرمن اقوام کی خاطر جواں
یہ تڑپ ہے یا ازل سے تیری خو ہے، کیا ہے یہ
رقص ہے، آوارگی ہے، جستجو ہے، کیا ہے یہ"؟
"خفتہ ہنگامے ہیں میری ہستی خاموش میں
پرورش پائی ہے میں نے صبح کی آغوش میں
مضطرب ہر دم مری تقدیر رکھتی ہے مجھے
جستجو میں لذت تنویر رکھتی ہے مجھے [15]

اقبال اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ صاحب ایمان، صاحب یقین آزاد فرد وہی ہے جو وجودیت کی زبان میں ذاتی اعتبار اور ذاتی اثباب کے مقام پر فائز ہو جائے۔ اقبال انسان اور خدا دونوں کو برتری دینے کے قائل ہیں۔ ان کے ہاں سعی ذاتی توفیق خداوند بھی ہے اور ارادہ صمیم۔ جبر و اختیار کے مسئلوں میں اقبال کے خیالات وجودیوں سے ملتے ہیں۔ اقبال انسان کی آزادی کے معتقد ہیں۔اقبال کی نظمیں شمع و پروانہ، سید کی لوح تربت، عشق اور موت، ساقی نامہ وجودی فکر کی حامل ہیں۔

ن۔م۔ راشد کی شاعری میں بھی وجودی نظریات وافکار ملتے ہیں۔ ان کی کتاب لا=انسان کو انسان کی تلاش سمجھتے ہیں۔ انہوں نے وجودی اذیت کرب، دہشت اور انسانی وجود کی ناگہانیت پر اصرار کیا ہے بلکہ دراصل انہوں نے قارئین کی توجہ ان صداقتوں کی طرف مبذول کی ہے۔ مثلاً ان کی نظم "خواب کی بستی"، "سپاہی، ایک رات، زوال، اظہار پہلی کرن، اسرافیل کی موت وجودی کرب کے احساس کی ترجمان نظر آتی ہیں۔ "اسرافیل کی موت" کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

مرگِ اسرافیل سے
حلقہ در حلقہ فرشتے نوحہ گر،
ابنِ آدم زلف در خاک ونزار
حضرت یزداں کی آنکھیں غم سے تار
آسمانوں کی صغیر آتی نہیں
عالم لاہوت سے کوئی نفیر آتی نہیں [16]

میراجی کی شاعری میں بھی ان کے وجودی نظریات سامنے آتے ہیں۔ کرکیگارڈ کی طرح میراجی نے نہ تو اپنی ذات توڑنے کی شعوری کوشش کی اور نہ ہی دنیاوی اعتبار سے کسی دوسرے کو اس کی اجازت دی ہے۔ میراجی نے پوری کائنات کو صرف ایک نقطے پر مرکوز کر دیا ہے۔ اپنے ہی جسم کو دوجہاں قرار دے کر وہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔

فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے ہاں بھی وجودیت کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ فیض نے اپنی شاعری میں ہر قسم کے تجربات کرنے کی کوشش کی ہے۔ فیض کا سلسلہ وجودیت، انسانی دوستی اور مارکسیت سے جڑا ہوا ہے۔ فیض احمد فیض کی نظمیں صبح آزادی اور تنہائی میں وجودی فکر نظر آتی ہے۔ فیض اپنی ایک نظم "تنہائی" میں وجودی کرب کو یوں بیان کرتے ہیں:

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہو گا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے ومینا وایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا [17]

احمد ندیم قاسمی نے اپنی نظم "انسان" میں ان خیالات کا یوں اظہار کیا:

خدا عظیم، زمانہ عظیم، وقت عظیم
اگر حقیر ہے کوئی یہاں تو صرف ندیم
وہی ندیم وہی لاڈلا بہشتوں کا
وہی ندیم جو مسجود تھا فرشتوں کا
وہ جس نے جبر سے وجدان کو بلند کہا
وہ جس نے وسعت عالم کو اک زقند کہا
وہ جس نے جرم محبت کی جب سزا پائی
تو کائنات کے صحراؤں میں بہار آئی
وہ جس نے فرش کو بھی عرش کا جمال دیا
جس نے تند عناصر کو ہنس کے ٹال دیا
بڑھا تو راہیں تراشیں، رکا تو قصر بنائے
اڑا تو گیت بکھیرے جھکا تو پھول کھلائے
وہ جس کے نام سے عظمت قسم اٹھاتی ہے
اسی کی آج خدائی ہنسی اڑاتی ہے [18]

مجید امجد حساس شاعر تھے، انسانی وجود کی بے قدری، ناپائیداری، تنہائی، عدم تحفظ نے انہیں کرب میں مبتلا کیا۔ ان کا دور بھی کشمکش زندگی سے بھرپور تھا۔ معاشرے کی توڑ پھوڑ کو وہ اپنے اندر محسوس کرتے ہیں، یہیں سے وجودی فکر پیدا ہوتی ہے۔ مجید امجد کی نظموں گدلے پانی، دروازے کے پھول، اے ری چڑیا، صاحب کا فروٹ فارم، ان خارزاروں میں، ہزاروں راستے ہیں، مرے خدا مرے دل وغیرہ میں وجودی عناصر تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ نظم "شاعر" میں لکھتے ہیں:

میں شاعر ہوں میری جمالیں نگہ میں
ذرا بھی نہیں فرق ذرے میں مہ میں
جہاں ایک تنکا سا ہے میری رہ میں
ہر اک چیز میرے لیے ہے فسانہ
ہر اک دوب سے سن رہا ہوں خزانہ
مرے فکر کے دام میں ہے زمانہ [19]

وزیر آغا کی شاعری میں بھی وجودیت کے پہلو مل جاتے ہیں۔ وزیر آغا انسان کے وجود کی بے ثباتی و ناپائیداری کا نقشہ خوبصورتی سے کھینچتے ہیں۔ جدید دور کی ترقیوں اور مشینی زندگی نے انسانی وجود کو اپنی زد میں لے لیا ہے۔ جس سے ایک اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ وزیر آغا نے اسی بے چینی و کرب کو اپنی نظموں میں سمو دیا ہے۔ آخری شب، رت جگا، اکیلا، سفر کا دوسرا مرحلہ اس حوالے سے اہم نظمیں ہیں۔

منیر نیازی کے کلام میں وجودی رنگ زندگی کی محرومیوں، بچپن میں والد کے انتقال، والدہ کا دوسری شادی کرنا، بیوی کی موت، دوسری شادی کے معاملات، ملازمت سے فرار، اپنے دور کے کرب و اداسی، تنہائی، ہجرت، فسادات، خوریزی، تہذیب کی پامالی، معاشرتی جبر، اقدار کی ٹوٹ پھوٹ، خود غرض معاشرے کی منافقت سے دل برداشتہ ہو کر پیدا ہوتی ہے۔ انہی اثرات کے تحت منیر نیازی اپنی ذات کی تلاش کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اس حوالے سے مختلف سوالات بھی کرتے ہیں اور ان کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ منیر نیازی کے ہاں وجودیت کا آغاز ذات کے عشق اور خود مرکزیت سے ہوتا ہے۔ ان کی نظمیں خدا کو اپنے ہمزاد کا انتظار ہے، خوف میری خوراک ہے وغیرہ وجودی عناصر کی غمازہیں۔ منیر نیازی کے کلام میں وجودیت سے پیدا ہونے والے بڑے موضوعات میں تنہائی، خوف، فرد کی گمشدگی، کرب ذات سے غم زیست کا سفر، بچھڑے ہوؤں کی یاد شامل ہیں۔ انہیں بنیادی موضوعات سے منیر نیازی کے ہاں وجودیت کلام کا رنگ اختیار کرتی ہے۔

جدید نظم میں افتخار جالب، زاہد ڈار، سلیم الرحمان، جیلانی کامران، تبسم کاشمیری، عبدالرشد، سعادت سعید اور کشور ناہید، احمد ہمیش، خلیل مامون وغیرہ کے ہاں وجودیت کے نقوش ملتے ہیں۔ جو عہدِ جدید کی اس دنیا میں بے مکانی، بے حیثیتی، جیسے مسائل کو مدِ نظر رکھ کر مختلف اصطلاحات کو اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔

فلسفہ وجودیت نے جہاں اردو کی دوسری اصناف پر اپنے اثرات مرتب کیے وہاں اردو افسانہ پر بھی اس فلسفہ کے فکری اثرات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ جدید افسانوی ادب پر فلسفہ وجودیت کے اثرات بالواسطہ بہت گہرے مرتب ہوئے ہیں۔

افسانوی ادب میں ان کے اوّلین نقوش پریم چند کے افسانوں میں ملتے ہیں ان کا افسانہ کفن اس کی بہترین مثال ہے۔ سجاد ظہیر کے پانچ افسانے انگارے میں شامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں وجودیت کے مختلف پہلو بیان کئے گئے ہیں۔ اسی طرح سعادت حسن منٹو کے کئی افسانوں میں وجودیت کے عناصر جابجا نظر آتے ہیں۔ مثلاً افسانے جانکی، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ٹھنڈا گوشت، کھول دو، خوشیاں، سہانے وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں وجودی عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانے وہ کھوئے گئے، وجودی حوالے سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ خواب اور تقدیر، کایا کلپ اور آخری آدمی میں بھی وجودی عناصر ملتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے افسانے جلاوطن، رام لعل کے افسانے آنگن، قبر، خالدہ حسین کے افسانے سواری، ایک بوند لہو، عبد اللہ حسین کے افسانے ندی، انور سجاد کے افسانے گائے، کونپل، پرندے کی کہانی، منشایاد کے افسانے کنواں چل رہاہے وغیرہ میں واضح طور پر وجودی عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔

جدید علامتی افسانے میں قرۃ العین حیدر، رام لال، انتظار حسین، بلراج منیر، انور سجاد، غلام ثقلین نقوی، عبد اللہ حسین، منشایاد کے ہاں وجودی عناصر ملتے ہیں۔ دیگر افسانہ نگاروں نثار بٹ، انیس ناگی، انور سجاد، فہیم اعظمی، جوگندر پال، انور سن رائے، رشید امجد، مسعود اشعر، اسد محمد خان، اعجاز راہی، احمد جاوید، انوار احمد، احمد ہمیش، انور خان، سریندر پرکاش، بلراج منیر وغیرہ کے ہاں بھی وجود عناصر ملتے ہیں۔ افسانوی ادب میں وجودی افکار و نظریات شعوری اور لاشعوری طور پر تمام افسانہ نگاروں کے ہاں ملتے ہیں۔

اردو ناول نگاری میں بھی بعض ناول نگاروں کے ہاں وجودیت کے عناصر مل جاتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا ناول آگ کا دریا اس کی بہترین مثال ہے۔ ناول کے آغاز سے لے کے آخر تک وجودیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے اس ناول میں شعوری وغیرہ شعوری طور پہ وجودی نظریے کی حمایت دکھائی دیتی ہے۔

نثار عزیز بٹ کے ناول "کاروان وجود" میں بھی وجودی عناصر نمایاں ہیں۔ اس ناول میں دو کرداروں ثمر اور سارہ کے ذریعے عینیت پسندی اور وجودیت کے فلسفے کو واضح کیا گیا ہے۔ وجودی فکر رکھنے والے اردو کے اہم ناول نگار ڈاکٹر انیس ناگی ہیں۔ انہوں نے کامیوں کے ناولوں کے تراجم بھی کیے۔ وہ براہ راست فرانسیسی سے واقفیت رکھنے کی بنا پر وجودی فلسفے کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے دو ناول "میں اور

وہ" اور" دیوار کے پیچھے" وجودی فلسفے کے حامل ہیں۔ خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں ایسی لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنے وجود کی تلاش میں کشمکش کا شکار دکھائی دیتی ہے۔ عبد اللہ حسین کے ناول "اداس نسلیں" میں بھی بعض مقامات پر وجودی فکر مل جاتی ہے۔ بانو قدسیہ کے ناول راجہ گدھ میں قیوم، سیمی اور امتل وجودی فکر کے نمائندہ کردار ہیں۔ انیس ناگی کے ناول پتلیاں، عاصم بٹ کے ناولوں دائرہ، ناتمام، بھید، خالد جاوید کے ناول نعمت خانہ علاوہ ازیں مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں بھی وجودیت کے اثرات نظر آتے ہیں۔

اسی طرح ہمیں اردو شاعری، افسانہ اور ناول میں وجودیت کے مختلف عناصر بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں۔ وجودیت پر اردو میں کوئی خاص تحریک بن کر نہیں اُبھری اس کے مختلف نظریات اردو ادب میں مل جاتے ہیں۔ اس حوالے سے وحید اختر لکھتے ہیں:

> اردو کے ادیبوں میں وجودی اور غیر وجودی کا امتیاز کرنے کا سوال ہی نہیں کیونکہ کوئی بھی شاعر، ناولسٹ یا افسانہ نگار اس مکتب فکر کا پیرو ہے نہ مفسر لیکن جدید عہد کے بہت سے شاعروں، افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں کے یہاں ہمیں وجودیت کے عناصر منتشر حالت میں مل جائیں گے۔[20]

انسانی وجود، معاشرہ اور اقدار و روایات سب مل جل کر ایک معاشرہ بناتے ہیں۔ اسی لیے انسانی وجود کو ہر حال میں اہمیت حاصل ہے لیکن یہ بات انسان پہ مبنی کہ وہ اپنے وجود اور اہمیت کس طرح دیکھتا ہے۔ اپنی زندگی میں کس مقصد کو اہم جانتا ہے۔ جتنے بھی نظریات اور فلسفے آئے ہیں ان میں فرد کی ذات اہم ہے۔ اور یہ فرد جب تک کائنات میں موجود ہے اس سے کئی زاویوں میں دیکھا اور پرکھا جاتا رہا ہے اور پرکھا جاتا رہے گا۔ وجود ہی سے اس کائنات کاوجود ممکن ہے۔اس لیے فلسفہ وجودیت ہر دور میں اہمیت کا حامل رہا ہے۔ماضی ،حال اور انسانی مستقبل کے ادب و فلسفہ پر اس کے اثرات قائم رہیں گے۔اصل میں مطالعہ کائنات کا لازمی جزو مطالعہ انسان ہے۔اس لیے ہر دور میں چاہے وجودیت تحریک کی صورت میں موجود نہ بھی ہو مگر اس کے بنیادی عناصر ہر ادب کے دور کو متاثر کرتے رہیں گے۔

حوالہ جات:

1 سعادت سعید، ڈاکٹر، **ادب اور نفی ادب**، (لاہور: دستاویز مطبوعات، 1998ء)، ص105-

2 سہیل احمد خان، ڈاکٹر، سلیم اختر، ڈاکٹر، **منتخب ادبی اصطلاحات**، (لاہور: شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی، 2005ء)، ص78-

3 سی اے قادر، ڈاکٹر، **پاکستان میں فلسفیانہ رجحانات**، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1993ء)، ص103-

4 ایضاً

5 جمیل جالبی، ڈاکٹر، **تنقید اور تجربہ**، (لاہور: یونیورسل بکس، 1967ء)، ص367-

6 شاہین مفتی، ڈاکٹر، **جدید اردو نظم میں وجودیت**، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2001ء)، ص15-

7 قاضی جاوید، **وجودیت**، (لاہور: فکشن ہاؤس، 2005ء)، ص17-18-

8 عرش صدیقی، **وجودیت کیا ہے؟**، (مشمولہ ادبی دنیا شمارہ، 5، 1964ء)، ص246-

9 شاہین مفتی، ڈاکٹر، **جدید اردو نظم میں وجودیت**، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2001ء)، ص15-

10 ایضاً، ص31-

11 ایضاً، ص33-

12 قاضی جاوید، **وجودیت**، (لاہور: فکشن ہاؤس، 2005ء)، ص90-

13 ایضاً، ص15-

14 شاہین مفتی، ڈاکٹر، **جدید اردو نظم میں وجودیت**، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2001ء)، ص48-

15 اقبال، علامہ، **کلیات اقبال**، (لاہور: اقبال اکادمی، 1994ء)، ص266-267-

16 ن۔م۔راشد، **کلیات راشد**، (لاہور: ماورا پبلشرز، 1988ء)، ص283-284-

17 فیض احمد فیض، **نقش فریادی**، (دہلی: اردو گھر، 1941ء)، ص72-

18 احمد ندیم قاسمی، **انتخاب کلیاتِ احمد ندیم قاسمی**، (نئی دہلی: فرید بک ڈپو، 2024ء)، ص231-

19 خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، مرتب، **کلیات مجید امجد**، (نئی دہلی: فرید بک ڈپو، 2011ء)، ص42-

20 عظمت رباب، **وجودیت ایک مطالعہ**، مشمولہ کرن، (لاہور: لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، 2007ء)،)ص28-